مغربی فکر و تہذیب
تعارف اور تجزیہ

تاریخی پس منظر:

کسی تہذیب یا کسی قوم کے عام مزاج و فکر کے بارے میں یہ بتلانا کہ اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے، بڑا مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ جیسے کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ ٹھیک فلاں لمحے اس کو نیند آئی، اسی طرح تہذیبوں کے آغاز کے لیے آپ تاریخ میں کوئی لائن کھینچ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہاں سے فلاں تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔

موجودہ مغربی تہذیب کا سلسلۂ نسب بعض مؤرخین نے قدیم یونانی اور رومن تہذیب سے جوڑا ہے۔ خود مغرب بھی اپنے اس ''عروج و ترقی'' کو ''نشاۃ ثانیہ'' کہتا ہے یعنی قدیم یونانی و رومی تہذیب کا دور یورپ کی پہلی ترقی و عروج کا دور تھا۔ لیکن نہ صرف یہ کہ غور کی نگاہ دونوں کے درمیان کسی تہذیبی وفکری وراثت کا سراغ لگانے سے قاصر ہے، بلکہ مغربی فکر کی جو اصل بنیاد ہے یعنی دین و اخلاق کا انکار، الحاد اور آزادی کا وہ معروف نظریہ جو مغربی تہذیب کی سب سے بڑی پہچان ہے، اسکا تو یونان و روم کی تہذیب کی تشکیل میں کوئی دخل ہی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قدیم یونانی و رومی تہذیبیں اپنی مادیت پرستی، تعیش پسندی، اسراف اور ظالمانہ نظام میں مغرب کی پیش رو ہیں۔ مگر یہ مزاج و اخلاق کچھ روم و یونان کے ساتھ خاص نہیں۔ دین صحیح سے محروم اور خدا پرستی سے غافل ہر خوش حال غالب قوم کا یہی حال ہوتا ہے، کلا ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنیٰ۔

مغربی تہذیب چرچ کے استحصال اور جہالت کا ردعمل ہے:

سب سے پہلے اجمالی طور پر اس بات کو سمجھ لیجیے کہ آج ہم کو جس مغربی فکر اور تہذیب کا سامنا ہے، اس کی اصل فکری بنیاد مذہب بیزاری، خدا فراموشی، اور ان اخلاقی اصولوں کے انکار پر ہے جو انسانی معاشروں میں موروث چلے آئے ہیں۔ مذہب بیزاری اور اخلاقی اصولوں کا انکار یہ دراصل قرون مظلمہ میں محرف عیسائیت کی جہالت اور چرچ کے ظلم و استحصال کا ردعمل ہے۔ مغرب صدیوں مذہب کے نام پر جہالت پھیلانے والوں اور مذہب کے ٹھیکے دار طبقے، یعنی چرچ، کے لرزہ خیز مظالم کا شکار رہا تھا، یہ تہذیب جسے مغربی مؤرخین نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں اسی ظلم و جہالت کے خلاف لمبی جدو جہد اور گہری نفرت کی پیداوار ہے۔

مغربی تہذیب کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ بنیادی حقیقت ملحوظ نظر رکھیے کہ یہ تہذیب کسی قوم کے مثبت غور فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ سراسر ایک ردعمل کی کیفیت کی پیداوار ہے۔ یہ ردعمل مذہب و اخلاق کے نام لیواؤں کے اس شدید و طویل ظلم اور ان مضحکہ خیز اور الم ناک جہالتوں کا نتیجہ ہے جن کا سلسلہ کم و بیش ایک ہزار سال جاری رہا، اور جس کے خلاف اہل علم، مفکرین اور سائنسدانوں نے صدیوں جدو جہد کی ہے، اس لیے یہ ردعمل بڑا شدید ہے اور مغرب کی نفسیات میں اس کے اثرات نہایت گہرے پیوست ہیں۔ مغرب اور مغربی فکر کو سمجھنے کے لیے اس نفسیاتی عوامل کو سمجھنا بنیادی شرط ہے۔ مغرب کے اس دور کو قرون مظلمہ کہتے ہیں۔ جدید مغربی تہذیب کو سمجھنے کے لیے قرون مظلمہ اور اس کی سب سے بڑے عامل (Actor) چرچ اور عیسائی مذہبی طبقوں کے حال سے واقفیت ضروری ہے۔

چرچ اوراس کے اختیارات:

واضح رہے کہ عیسائیت میں چرچ ایک منظّم ادارہ رہا ہے۔ نصرانی تاریخ کے ماہرین کہتے ہیں کہ تیسری صدی میں قسطنطین نے جب سے اپنی حکومت میں عیسائیت سے مدد لی چرچ ایک لگا تار منظّم طاقت کے مرکز کے طور پر بڑھتا رہا۔ پانچویں صدی میں رومن امپائر کے سقوط کے بعد وہی بڑی طاقت بن گیا۔ چرچ کی اس حیثیت کا بڑا سبب یہ غلو آمیز فکر تھی کہ وہ گویا خدا کا نائب اور زمینی نمائندہ ہے۔ یہاں تک کہ نویں صدی میں پوپ نکولس اول نے تو اس کو انسانوں کا مالک اور ''خدا'' ہی بنا دیا۔ اس نے ایک خاص اصول یہ بتایا اور اس کی تبلیغ کی کہ حضرت عیسیٰ مسیح نے جو اپنی ذات میں خدائی عنصر کے بھی حامل تھے، پطرس حواری کو اپنا نائب بنایا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ میں تم کو زمین وآسمان کی کنجیوں کا مالک بناتا ہوں، لہٰذا پطرس ان تمام اختیارات کے مالک بنے جو خدا کے بیٹے مسیح کو حاصل تھے۔ پطرس کی وفات روم میں ہوئی۔ ان کے بعد رومن چرچ کا پوپ ان اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو تمام انسانوں خصوصا عیسائیوں پر وہ تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو خدا کے بیٹے مسیح کو حاصل تھے۔ خلاصہ یہ کہ پوپ زمین میں خدا کا نائب ہے۔ اور واضح الفاظ میں اس کا دعویٰ کرتا تھا کہ اس خدائی اختیار کی بنا پر تمام بندے چاہے وہ حکم راں ہی کیوں نہ ہوں اس کے محکوم ہیں۔ اسی بنا پر وہ معصوم (Infallible) ہے۔ اس کو تحلیل وتحریم کے تمام اختیارات حاصل ہیں۔ (Saint Nicholas 1, jules Roy, London 1901, P: 106-107)

یورپ کا دور سیاہ:

اگر چہ کچھ مؤرخین تیرہویں صدی کو عیسوی کو جدید مغربی فکر وتہذیب کے آغاز کا دور مانتے ہیں۔ مگر عموماً پانچویں صدی کے آخر سے چودہویں پندرہویں صدی تک کا دور مغرب کی تاریخ میں قرون مظلمہ (Dark Ages) یا قرون وسطیٰ (Medeival Ages) کہا جاتا ہے۔ (Encyclopadia Britanika: Dark Ages)۔ یورپ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی کافی پہلے سے ایک عظیم الشان منظّم سلطنت قائم تھی۔ مگر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمے تک وہ آخری درجے زوال وانحطاط بلکہ بکھراؤ کا شکار ہو چکی تھی۔

مغرب کا یہ دور کس قدر بھیانک ظلم، جہالت اور وحشیانہ سماجی نظام سے عبارت تھا اس کا اندازہ اس دور کی تاریخ کے کسی قدر مطالعے کے بغیر کوئی مشرقی انسان نہیں لگا سکتا۔ مذہب سراسر خرافات اور وہم پرستیوں کا مجموعہ بن چکا تھا۔ پانچویں صدی کے آخر میں مغربی رومن امپائر کے سقوط کے بعد سے یورپ سیاسی سماجی عقلی وعلمی زوال کی آخری حد کو پہنچ گیا۔ بریٹانیکا میں تاریخ یورپ کے تحت Middle Ages کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ ''اس پورے دور کو مسلسل جہالت، وہم پرستی اور اجتماعی مظالم کے لیے یاد کی جاتا ہے''۔

سیاسی وسماجی انتشار:

کسی منظّم حکومت کے بجائے گویا ہر علاقے میں امراء، نوابوں اور رجواڑوں کا دور تھا، جن میں لگا تار جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے بعد کا یورپ طوائف الملوکی کا بدترین نمونہ تھا۔ یورپ کے وہ مغربی وشمالی علاقے جو کبھی ایک نہایت عظیم وپرشکوہ امپائر کا حصہ ہوا کرتے تھے، ان میں اب ہر طرف تباہی وویرانی کی آگ لگی تھی۔ خانہ جنگی صدیوں کا معمول رہیں۔ مشہور برطانوی مؤرخ وادیب ہربرٹ ویلز نے لکھا ہے کہ اس دور میں مغربی یورپ مکمل انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا، یہاں کسی منظّم ریاست کا وجود نہیں تھا (A Short History of The World, p: 163)۔

Apart from that interlude, no large kingdom or other political structure arose in Europe to provide stability.

The only force capable of providing a basis for social unity was the Roman Catholic Church.

معمولی وقفوں کے علاوہ اس پورے دور میں یورپ میں کوئی بڑی سلطنت یا سیاسی ڈھانچہ ایسا قائم نہیں ہوسکا جو استحکام فراہم کرسکتا۔ یورپ کو رومن کیتھولک چرچ کے علاوہ کوئی چیز سماجی طور پر جوڑنے والی نہیں تھی۔

Encyclop?dia Britannica. Encyclop?dia Britannica Ultimate Reference Suite. Chicago: Encyclop?dia Britannica, 2012. "Middle Ages."

مذہبی فساد و روحانی افلاس:

عیسائیت کی تحریف ایک عجیب المناک اور عبرت آموز تاریخ ہے۔ پال کی زبردست تحریف نے حضرت مسیح کے دین کی جگہ ایک نیا دین بنا ہی دیا تھا۔ مزید برآں رومن امپائر کے تخت پر قسطنطین اعظم ۳۰۵ء اپنے حریفوں کو عیسائیوں کی مدد سے شکست دے کر جب تخت پر بیٹھا تو اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور نصارائی کے دین و مذہب کو بالکل ہی مسخ کر ڈالا۔ اس نے علانیہ عیسائیت اختیار تو کی، مگر بڑی کامیابی کے ساتھ اس کی سیاست نے علماء مذہب کی لالچ کے ساتھ مل کر عیسائیت پر رومی بت پرستی اور شرک کا غلاف چڑھا دیا۔ یہ عیسائیت کی تاریخ کا خطرناک موڑ بلکہ تباہ کن واقعہ تھا۔ اس نے ایک خالص سیاسی مفاد کے پرستار بادشاہ کی حیثیت سے اپنی قوم کی بت پرستی اور اس کے رسوم ونشانات کی عزت افزائی بھی جاری رکھی مگر عیسائیوں کی حمایت لینے کے لیے عیسائیت کا چولہ بھی پہنے رہا۔ اس کا دربار عیسائیت اور بت پرستی کا مرقع تھا۔ بادشاہ کو عیسائیت سے کچھ بھی خلوص کا تعلق نہیں تھا، اس نے عیسائیوں اور اپنی قوم دونوں کے مزاج وعقائد کا ایک معجون مرکب بنا دیا۔ یہاں تک کہ رومن بت پرستی کی اساس یعنی تثلیث کو عیسائیت کی بنیاد بنا ڈالا۔ عیسائی رنگ میں وثنیت و بت پرستی کی پورے ملک میں خوب خوب اشاعت کی گئی۔ جس کی دلچسپ والم ناک تفصیل ڈریپر نے نقل کی ہے۔ اب عیسائیت یونانی ومصری بت پرستی کی ایک نئی شکل بن گئی تھی۔ اس سلسلے میں قسطنطین نے آخری فیصلہ ناسیا (Nicaea) کی مجلس بلا کر کر دیا جہاں تثلیث کو صحیح مذہب اور اس کے خلاف کو بدعت وکفر Herasy قرار دیا گیا۔ اور قیصر اعظم کی طاقت سے اس فیصلے کا نفاذ شروع ہوا۔ (معرکۂ مذہب وسائنس، از ولیم ڈریپر، صفحہ: ۱۵۸تا۱۶۵)۔

رومن حکومت کا عیسائیت کا لبادہ اوڑھنے کے بعد مذہبی طبقات کے ہاتھ میں اب حکومت اور اس کے وسائل تھے۔ پوپ کے زیر سایہ کارڈینلوں اور کلیسائی عہدے دار ہی نہیں چھوٹے چھوٹے پادریوں کے پاس جاگیروں کے ڈھیر لگ گئے۔ مالی فراوانی اور پرتعیش زندگی نے ان کو دین واخلاق کی اصل روح سے بہت دور کر دیا، یہ طبقہ لالچ اور اغراض پرستی جیسے امراض کا بری طرح شکار ہو گیا۔ اب مصیبت دوبالا ہو گئی اصل دین مٹ رہا تھا اور علماء مال پرستی میں مگن اور دولت اندوزی میں غرق تھے۔ چوتھی صدی عیسوی سے ہی دین مسیح میں اس کافرانہ تحریف کے خلاف بہت کچھ شورشیں اٹھتی رہیں، مگر حکومت کی سیاست اور زرخرید علماء سوء ان کو دباتے ہی گئے۔

اس کے بعد دقیق فلسفیانہ کلامی مباحث نے عیسائیت کا شیرازہ ہی بکھیر دیا۔ ان مسئلوں میں شہر شہر بلکہ گھر گھر جنگیں ہوئیں، جن کا سلسلہ دراز رہا اور جس کی تفصیل طولانی ہے۔ بس اس کے متعلق اتنا جان لینا کافی ہے کہ ان حالات سے یورپ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی جیسا کہ ابھی ''سیاسی وسماجی انتشار'' کے زیر عنوان بیان کیا گیا ہے۔

رہبانیت کا غلو:

آخر اللہ کے دردمند اور مخلص بندوں کو رہبانیت اور ترک دنیا کی پناہ لینی پڑی۔ مگر رہبانیت کے بدعتی غلو نے عیسائیت کو ایک عام انسان کے لیے ایک خوفناک تصور بنا دیا۔ محرف مذہب کی تعلیم تھی کہ جنت تارک الدنیا درویشوں ہی کے لیے ہے۔ زندگی کا لطف لینا خداطلبی کے منافی اور شادی اور بچوں کی مصروفیت لعنت قرار دی گئی۔ اس وبائی جنون کی حلات یہ تھی کہ ملکوں کی آبادیاں تیزی سے کم ہو گئیں۔ شہروں کی عام انسانی آبادیوں سے زیادہ راہبوں کی تعداد ہوتی تھی۔ رہبانیت کی تحریک ایسی عام ہوئی کہ ایک ایک شہر میں کئی کئی ''دیر'' (Monasteries) ہوتے تھے، مردوں کی طرح خاتون راہباؤں کے دیر الگ ہوتے تھے۔ اور ایک ایک میں ہزاروں راہب اور راہبائیں، جو دنیاوی متاع ولذت سے اجتناب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے جسم کو سخت تکلیفیں دینا بھی فضیلت وروحانیت کا کمال سمجھا جانے لگا۔ اس تجرد و ترک دنیا نے معاشرے کو صحیح روحانیت واخلاق سے مزید دور ونفور کر دیا، معاشرے کا ایک بڑا طبقہ عصیان وآلودگی پسند بن گیا۔ اور عام یورپین انسان کے ذہن میں یہ تصور پختہ ہوتا چلا گیا کہ مذہب زندگی کی رہنمائی کی چیز ہے ہی نہیں۔ اور

اخروی نجات کے لیے پادریوں اور راہبوں کا واسطہ کافی ہے۔

رہبانیت کا چلن تو ہو گیا، مگر ایسی سخت دنیا بیزاری اکثر لوگوں سے برداشت نہ ہو پائی۔ آخر دیر اور راہبوں کی خانقاہیں فساد و غلاظت کے اڈے بن گئے۔ ایک طرف عقیدت مند عوام کی جانب سے راہبوں کے لیے ہدایا اور نذروں کی بارش تھی۔ حال یہ تھا کہ ایک ایک راہب کے پاس ہزاروں کی تعداد میں کوٹھیاں اور غلاموں اور خدم وحشم ہونے کا تذکرہ معتبر مؤرخین نے کیا ہے۔ دوسری طرف رہبانیت کے ساتھ حیا سوز عیش وعشرت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ (قصۃ الحضارۃ:۱۶/۱۰۹)۔ قرآن نے کہا ہے: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (الحدید:27)

چرچ کے ذریعے عوام کا مذہبی استحصال:

چرچ نے یہ پٹی عوام کو پڑھادی تھی کہ اس کے واسطے کے بنا خدا تک رسائی اور نجات کا حصول محال ہے، اس روحانی منصب داری نے ان کو جاہل عقیدت مندوں اور وہم پرست عوام کا خدائے مطلق بنا دیا تھا۔ چرچ باقاعدہ معصوم عن الخطأ (Infallible) قرار دیا گیا تھا۔ شریعت میں تبدیلی ہی نہیں عقائد تک میں اس کو ہر طرح کے اختیار تھے۔ مرکزی رومن چرچ کی طرف سے متعین پادریوں کا طبقے کی زندگی کے ہر کام میں ضرورت تھی۔ جب تک پادری بپتسمہ نہ دے بچہ عیسائیت میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ پوری زندگی پادریوں اور رہبوں کی رہین منت تھی۔ وہی نکاح کرا سکتے تھے۔ وہی اتوار کی عبادت کروا سکتے تھے۔ کسی گناہ گار کی توبہ انہی کے سامنے اعتراف گناہ کیے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ راضی نہ ہوں تو کسی گناہ گار کی مغفرت نہیں۔ اور وہ باقاعدہ نذرانے لے کر مغفرت کے پروانے بانٹتے تھے۔ عیسائیت سے متعلق کسی اوسط درجے کی کتاب میں بھی آپ ان مضحکہ خیز حماقتوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ اور پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن کی آیت: اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللَّهِ "کے وہ کیسے مصداق تھے۔

کلیسا کا تسلّط:

اس عبائے تقدس کی انہوں نے خوب قیمت وصول کی۔ بادشاہ کو انہیں بہرحال راضی رکھنا پڑتا تھا، اور ہرز میں داران کی نگاہ غلط انداز سے ڈرتا رہتا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی سے ہی یورپ خصوصا شمالی ومغربی ممالک میں چرچ ایک مستقل سلطنت بن گیا تھا۔ بریٹانیکا میں لکھا گیا ہے: کسی طاقت ور حکومت نہ ہونے کی وجہ سے یورپ میں دو متوازی طاقتوں کی حکومت قائم ہوگئی، یہ دو طاقتیں تھیں: مذہبی چرچ اور دنیوی حکمراں۔ بریٹانیکا میں Middle Ages کے زیر عنوان ہی یہ بھی ہے کہ رومن امپائر کے خاتمے کے بعد یورپ ایک عظیم کلیسائی مملکت (Church State) بن گیا، جس کو (Christendom) کہا جاتا تھا۔ یہ مملکت اصولی طور پر دو خانوں میں بٹی مانی جاتی تھی، Sacredotium یعنی کلیسائی مقتدرہ جو مذہبی وروحانی اختیارات رکھتی تھی، اور Imperium یعنی دنیاوی حکومت۔ نظریاتی طور پر تو دونوں فریقوں کو عوام کی الگ الگ روحانی اور دنیاوی ضروریات کی تکمیل کرنی تھی، مگر عملا دونوں میں لگاتار آویزش وکشمکش چلتی تھی جو خونریزیوں تک بھی جا پہنچتی تھی۔ مگر چرچ ہی بالادست طاقت تھا۔ بادشاہوں کو آخر اس کے سامنے جھکنا ہی پڑتا تھا...... چرچ کے پاس اپنی فوج ہوا کرتی اور بہت سے شہروں پر اس کا قبضہ۔ مگر اس کی اصل طاقت مذہبی تقدس اور خدائی نمائندگی کا منصب تھا۔ جس سے وہ بادشاہوں کے عزل ونصب کا بھی مالک بن بیٹھتا۔ ("Middle Ages." Encyclopaedia Britannica. Encyclopaedia Britannica Ultimate Reference Suite. Chicago: Encyclopaedia Britannica, 2012)

عوام کی جو غیر معمولی عقیدت چرچ کو حاصل تھی اس کو ایک عظیم مادی طاقت وجبر کے نظام کا ذریعہ بنالیا۔ جرمن بادشاہ ہنری چہارم نے پوپ کے کچھ اختیارات اور مالگزاری کو محدود کرنا چاہا۔ پوپ نے اس کے اور اس کے قریبی لوگوں کے معزول اور تمام رعایا کو اس کی اطاعت سے آزاد ہونے کا حکم صادر کر دیا۔ امراء نے فوراً مجلس شوریٰ منعقد کی اور طے کیا کہ اگر بادشاہ نے پوپ سے اپنا گناہ معاف نہیں کرایا تو اس کو معزول کر دیا جائے گا۔ بے چارہ

بادشاہ اچھوت بن گیا۔سخت سردی میں جرمنی سے پہاڑوں کوعبور کرتا ہوا افتاں خیزاں شمالی اٹلی میں کانوسا پہنچا اور پوپ کے قلعے کے باہر ننگے پاؤں راہبوں کے لباس میں تین دن تک عاجزی کا اظہار کرتا رہا۔ یہاں تک مغفرت کا پروانہ حاصل کیا۔

(The Story of the Christian Church, Jesse Lyman Hurlbut Zondervan,1967)

مالی استحصال:

عوام کی عقیدت بلکہ وہم پرستیوں کا چرچ نے عجیب وغریب استحصال کیا۔لوگوں سے اپنے لیے نا قابل یقین مقدار میں اوقاف وعطایا وصول کیے، اور بادشاہوں کی جاں بخشی اوران کوحکومت کرنے دینے کے عوض میں لامحدود جاگیریں حاصل کیں۔ بادشاہوں نے بھی اپنے اقتدار کے لیے چرچ کی منہ بھرائی کی اور چرچ نے اپنے حرص وآز کی خاطر زمین داروں اور بادشاہوں کی حمایت کی۔ظلم واستحصال کا یہی دوطرفہ شکنجہ تھا جس کے خلاف یورپ بہت طویل صبرآزما ابتلاء کے بعدلیکن آخر کار اٹھ کھڑا ہوا، اوراسی بغاوت کے خمیر سے نئی مغربی تہذیب کا اٹھان ہوا ہے۔ چرچ کے مالی استحصال کے بارے میں ول ڈیورانٹ لکھتا ہے:

> اس دور میں کلیسا یورپ کا سب سے بڑا زمیں دار اور جاگیردار تھا۔مثلاً ’فلڈا‘ کے ’دیر‘(Monastery) کے پاس پندرہ ہزار کوٹھیاں اور محلات تھے۔ ایک اور دیر کی املاک کا حال یہ تھا کہ اس کی ’’زمین کے غلاموں‘‘ کی تعداد دو ہزار تھی۔الکوین ویٹر کے پاس پچیس ہزار ’’زمین کے غلام‘‘ تھے۔۔۔۔۔اسطرح کلیسا جاگیردارانہ نظام کا ایک حصہ بن گیا۔اوراس کے مادی املاک ومنافع اور محصولات کی مقدار اتنی تھی جس کسی بھی مسیحی کا شرم آتی تھی۔یہی چیز دین کے باغیوں کے لیے استہزاء وتمسخر کا سامان بنتی تھی۔اور یہی دولت وحرص پوپوں اور پیٹر یارکوں میں جنگ وجدل کی آگ بھڑکاتی تھی۔(قصۃ الحضارۃ:۴/۴۲۸ باختصار)

ول ڈیورانٹ کا یہ اقتباس چرچ کی دولت اندوزی کا پورا اندازہ نہیں کراتا، ہربرٹ فشر نے لکھا ہے کہ چارلس مارٹن کے زمانے (آٹھویں صدی) میں گال (مغربی وشمالی یورپ) کی ایک تہائی زمینیں چرچ کی ملکیت میں آ چکی تھیں(Herbert Fisher The medieval Empire: vol:1, p 307)۔یہ صورت حال فرانسیسی انقلاب تک باقی تھی۔ایک ’’دلچسپ‘‘ معاصر مصنف ہیرالڈ ہیمنوے لکھتا ہے کہ فرانسیسی انقلاب تک یورپ کی ایک تہائی زمینیں چرچ کی ملکیت تھیں۔

(European History Foretold, Harold Hemenway, Xulon Press, 01-Oct-2007 p: 156)

خود فرانس کا حال شاید سب سے برا تھا، ایلیسن نے انقلاب فرانس کے وقت کا حال لکھا ہے کہ عوام سے چرچ جو مذہبی ٹیکس وصول کرتا تھا اس کی مقدار تیرہ کرور فرینک تھی، مگر یہ عظیم مقدار چرچ کی دولت کا نہایت معمولی حصہ تھی۔ چرچ کی اصل بادشاہت تو زمینوں کی ملکیت سے قائم تھی۔فرانس کی زمینوں کا تقریباً نصف بلاشرکت غیرے اس کی ملکیت تھا۔

(History of Europe During the French Revolution, By Archibald Alison, Cambridge University Press,2011)

ان زمینوں کی آمدنیوں سے چرچ کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوگئی تھی، ۱۵۰۲ء میں فرانس کی پارلیمنٹ میں ایڈوکیٹ جرنل نے اس کا اندازہ پورے فرانس کی دولت کا تین چوتھائی (75%) بتایا تھا۔اسی زمانے میں ایک مذہبی مجلس نے چرچ کو جرمنی کی نصف دولت پر قابض بتایا تھا۔(قصۃ الحضارۃ: ۳۹/۰)۔ چرچ حکومتوں کی طرح عوام سے ٹیکس وصول کرتا تھا، مذہبی عشر (Tithe) اس کے علاوہ تھا۔مرنے کے وقت وصیت ضروری تھی، اگر کوئی وصیت کیے بغیر مرگیا تو اس کی جائداد چرچ کی ملکیت بن جاتی تھی، اور وصیت لکھنا یہ پادری کا کام تھا، اور جب ’’متبرک‘‘ پادری وصیت لکھنے تشریف لائیں گے تو ان کی خدمت میں نذرگزارنا تو لازمی ہی ٹھیرا۔

ول ڈیورانٹ نے لکھا ہے کہ چرچ کی یہ بے پناہ دولت ہی الحاد کا بڑا سبب تھی۔

عقلی غلامی اور علمی پابندی:

مسیحیت کی تحریف نے اس کو ایک لانحل عقدہ بنا دیا تھا۔ تثلیث یعنی خدائے واحد کا تین بھی ہونا اور ایک بھی ہونا ایسے عقائد میں سے ہی تھا۔ بپتسمہ بھی ایسا ہی ایک مقدس راز تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو مومن (عیسائی) ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پادری اس کو غسل دے یا کم از کم اس کے اوپر پانی بطور تبریک چھڑکے۔ ایک خاص عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کی یاد میں جس ''عشاء ربانی'' نام کی رسم کا انعقاد ہوتا ہے اور اس میں پادری کے ہاتھ سے شراب اور روٹی کا ٹکڑا دیا جاتا ہے اس میں روٹی کا ٹکڑا (معاذ اللہ) عیسیٰ کا گوشت اور شراب ان کا خون بن جاتے ہیں۔ اور یہ صرف علامتی اور یادگار کے طور پر نہیں حقیقت میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی باتیں تھیں جو معمّہ تھیں۔ چرچ نے ایک عظیم جرم یہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا حق دے لیا تھا۔ گناہگار پادری کے سامنے حاضر ہو کر اعتراف کر لے اور کچھ دے دلا کر یا کچھ وظائف پڑھ کر اس کے گناہ کی معافی کا ایک وثیقہ جاری کر دیا جاتا تھا۔ شروع سے ہی آزاد خیال طبیعتیں ان پر اعتراض کرتی تھیں۔ چرچ نے ایسی باتوں کو اسرار مقدسہ قرار دیتے ہوئے ان پر اشکال کرنے والوں کو منافق اور بدعتی قرار دیا اور ان کو سخت سزائیں جو بسا اوقات قتل تک کی ہوتی تھیں دی گئیں۔ ان اسرار مقدسہ کو کیتھولک اصطلاح میں Sacraments اور آرتھوڈاکس اصطلاح میں Sacred Mystries کہتے ہیں۔

چرچ کے اسی استبدادی کردار کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ گیارہویں صدی کے بعد جب عالم اسلام کے راستے یورپ میں علم وتہذیب کی روشنی پہنچنی شروع ہوئی تو چرچ نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور نئے افکار کے حاملین سیکڑوں ہزاروں علماء کو سزائیں دیں، جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

اہل مذہب کی اخلاقی پستیاں:

یہ نقلی مذہب اور اہل مذہب کی پست اور طمع آمیز فطرت اخلاقی انحطاط کی تھاہ تک پہنچ کر رہی۔ کوئی گندگی اور کوئی رذیل حرکت ایسی نہیں تھی جس کا شکار ایک بڑی تعداد نہ ہو۔ خاص طور پر رشوت ستانی تو روزانہ کا کاروبار بن گئی، پوپ کے تقرر سے لے کر معمولی پادری کے عزل ونصب تک، راہبوں کے دیر اور چرچ کے اوقاف تک ہر جگہ رشوت کی گرم بازاری تھی۔ اہل کلیسا کی زندگی نوابوں کے لیے بھی رشک کا سامان بن گئی تھی۔

تیرہویں صدی عیسوی کے بارے میں ول ڈیورانٹ کلیسائی مؤرخین کے حوالے سے لکھتا ہے:

> شہروں کے چرچ عموماً عبادت کرنے والوں سے خالی ہوگئے ...... یہی حال گاؤں دیہات کا تھا، جہاں لوگ عورتوں کے ساتھ رقص وسرود کرتے، عید وغیرہ کے موقع پر بھی عبادت یا مقدس کلام کے سننے میں تو برائے نام وقت خرچ ہوتا، باقی وقت یا کھیل تماشے یا شراب خانوں میں جاتا۔ جھوٹ گندگی مکاری عہد شکنی عام تھی۔ ان کے ضمیر بھی مردہ ہو چکے تھے...... پادریوں کا حال عوام کے سلسلے میں اس چرواہے کا سا تھا جس کو اپنی بھیڑوں کے صرف دودھ، بال اور کھال سے دلچسپی ہو۔ وہ ان کی اصلاح کی فکر کیا کرتے خود ان کے اعمال بھی ایسے ہی تھے۔

یہی مورخ مختلف مصنفین کا حوالہ دیتا ہے کہ انہوں نے چودھویں، پندرہویں اور سولہویں صدی کے چرچ اور مذہبی طبقات کی ایسی ہی شرمناک اخلاقی حالت خصوصاً شہوانی جرائم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ ماسچیو (Masthcio) نے راہبوں کو ''شیطان کے چیلے'' کہا ہے۔ اور لکھا ہے کہ انہوں نے فسق وطمع، ہم جنسی اور رشوت ستانی کے علاوہ مذہبی عہدوں کی خرید وفروخت کا کاروبار اختیار کر رکھا تھا۔

رہبانیت بھی عیاشیوں کا شکار ہوگئی تھی۔ راہبات جن کی تعداد ہزار ہا ہزار میں ہوتی تھی، ان کا بھی یہی حال تھا۔ مردوں اور عورتوں کے دیر (خانقاہیں) ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اور ناجائز روابط اور تعلقات کی وبا ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ صرف ان دیروں کے بدکاری کے مقدمات کے رجسٹر بیس بیس جلدوں میں ہیں۔ اطالوی ادیب اریٹینو (Pietro Aretino) نے بندقیہ (Venice) کی راہبات کے جو حالات لکھے ہیں وہ ناقابل نقل ہیں۔

سینٹ کیتھرین کہتی ہیں: تم مذہبی طبقات میں جدھر نظر کرو، چاہے پادریوں کو دیکھو چاہے بشپوں کو یا راہبوں کو، سوائے شر وفساد کے کچھ نہیں دکھے گا۔ ہر طرف سڑانڈ ہی سڑانڈ اور گناہوں کی گندگی ہے، یہ سب لالچی، بخیل روحانیت سے عاری، پیٹ کے بندے اور فسق وفجور کے عادی ہیں۔ غریبوں کے

مال سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔(قصۃ الحضارۃ:۲۱/۹۔۷۔۸۴)

ول ڈیورانٹ چودھویں صدی کے کلیسا کو اخلاقی فساد وانحطاط کے آخری درجے پر دیکھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رشوت، مذہب فروشی اور ٹیکسوں کی بے پناہ رقم کا بڑا حصہ عیاشیوں میں خرچ ہوتا، اس کا ایک بڑا حصہ پادریوں کی ان داشتاؤں کا حق تھا جو اپنے بازار کی سب سے اونچی قیمت والی ہوتی تھیں۔(قصۃ الحضارۃ:۲۲/۱۸۔۲۲)

خوفناک ظلم واستحصال پر مبنی اجتماعی نظام:

قرون مظلمہ کا یورپ انسانی ٹریجڈی کا المناک منظر پیش کر رہا تھا۔پوری سوسائٹی ظلم کے بندھنوں میں اس حد تک بندھی ہوئی تھی کہ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔چھٹی صدی کے آتے آتے پورا یورپ ظلم واستبداد کے ایک گھناؤنے مثلّث میں پھنس چکا تھا۔یہ مثلث میں ایک طرف بادشاہ اور حکومت تھی، دوسری طرف چرچ اور تیسری طرف جاگیردار۔

انسانوں کو چار حصوں میں باٹا گیا تھا۔ایک تعداد غلاموں کی تھی۔ایک چھوٹی تعداد آزاد انسانوں کی تھی۔یہ اعیان واشراف، جاگیرداران، کارپردازان حکومت، چرچ اور مذہب کے نمائندگان، فوجی، اصحاب صنعت وحرفت اور تاجروں پر مشتمل طبقہ تھا۔اس کی تعداد کافی کم تھی۔کچھ کسان بھی اپنی زمین کے مالک اور آزاد ہوتے تھے۔مگر ان کی تعداد اتنی کم ہوتی تھی کہ گیارہویں صدی میں انگلینڈ اور عموماً مغربی یورپ کے کل کسانوں میں ان کی تعداد صرف چار فی صد تھی۔

یورپ کا جاگیردارانہ نظام:

بادشاہوں نے بتدریج یہ نظام بنالیا کہ علاقائی امراء کو بڑے بڑے علاقے اس شرط پر دیے جاتے تھے کہ وہ سالانہ اتنی رقم بطور ٹیکس بادشاہ کو دیں گے، اور اپنے علاقے سے بادشاہ کی جنگوں کے لیے فوج فراہم کریں گے۔یہ امراء اپنے نیچے چھوٹے نوابوں اور تعلقے داروں میں زمینیں باٹ دیتے، ان کے نیچے زمیں دار ہوتے۔اس طرح یہ کثیر سطحی زمیں داری کا نظام ہوتا، جس میں کسان خود زمین کا مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ زمیں دار کی زمین پر کھیتی کرتا، اس کو لگان دیتا، اور اس کو جنگوں میں لڑنا بھی پڑتا۔

زمین کے غلام SERF:

صنعتی انقلاب سے پہلے بڑے شہر بہت کم ہوتے تھے۔انسانوں کی معیشت کا اصل اور بڑا ذریعہ زمین ہی تھی۔آزاد کسانوں کی مقدار تو بس چار فیصد ہی تھی۔ان کے علاوہ ملکوں کی بڑی تعداد زمین کے بندھوا مزدور کسانوں کی تھی جنہیں زمین کا غلام (Serf، یا Villein) کہا جاتا تھا۔ملکوں کی آبادی کی بڑی تعداد ان پر مشتمل تھی۔ایشیا اور مشرقی ممالک کی تاریخ چوں کہ اس نظام سے خالی رہی ہے اس لیے آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یورپ کا زمیں داری کا نظام کیسے سنگ دلانہ جبر وظلم کا نظام تھا۔یہ مشرقی ممالک کی زمیں داری سے بالکل ایک مختلف نظام تھا۔یہاں زمیں دار کو لگان دینے والا کسان نہیں ہوتا تھا، بلکہ زمین کا غلام ہوتا تھا۔

SERF یا زمین کا غلام وہ شخص جس کو کوئی امیر یا (Baron) یعنی جاگیردار زمین کا کوئی حصہ تمام عمر کھیتی کے لیے دے دیا کرتا تھا۔اب وہ کسان اس امیر یا جاگیردار کی رعایا بن جایا کرتا تھا اور امیر کے ذمے اس کی حفاظت ہوتی تھی۔یہ کسان سالانہ لگان دیتا تھا، اس کو اپنی زمین چھوڑنے یا زمیں دار سے آزاد ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ہاں زمیں دار چاہے تو اس کو زمین سے نکال سکتا تھا۔غلاموں ہی کی طرح ان کسانوں کی خرید فروخت ہو سکتی تھی۔

زمین کے غلام کے ذمے اپنی اور اپنی اولاد کی ذات کا ایک ٹیکس ہوتا تھا، جو زمیں دار کے واسطے سے حکومت کو جاتا تھا۔فصل ہو نہ ہو سالانہ زمین کا لگان دینا ہوتا تھا، اور اس کے علاوہ غلہ اور جانوروں کا ٹیکس جو اکثر دسواں حصہ ہوتا تھا۔سال میں کافی دن بنا اجرت اپنے مالک کی بیگار اس کے ذمے تھی۔

جاگیردار کو اسی شرط پر جاگیر ملتی تھی کہ وہ بادشاہ کے لیے لڑاکے فراہم کرے گا۔ بادشاہ اور امراء کی جنگوں میں بطور لڑاکے کے ایندھن بننا زمین کے غلام کا فرض تھا جس سے وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا مالک اگر قید ہوجائے تو اس کو فدیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ زمیں دار کا بچہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یا کلیسائی خدمت کے لیے جائے تو یہ زمیں دار کا نقصان تھا اور اس کا واجبی معاوضہ کسان کو ادا کرنا تھا۔

اگر کوئی کسان اسی مالک کے زمین کے غلاموں میں اپنی یا اپنی اولاد کی شادی کرے تو کوئی بات نہیں مگر ان کے باہر اگر کوئی رشتہ کرنا ہو تو مالک کی اجازت ضروری تھی۔ کہیں کہیں ظلم وخباثت کا یہ قانون بھی تھا کہ زمین کے غلام کے یہاں جو بھی شادی ہو تو زمیں دار کو پہلی رات کا حق حاصل تھا۔ ہاں کبھی کسان کچھ مال دے کر یہ حق معاف کرالیتا تھا۔ (قصۃ الحضارۃ:۱۴/۴۰۸)

اس بھیانک ظلم کا نقیب وحامی چرچ:

چرچ خود زبردست جاگیروں کا مالک تھا۔ مذہبی طبقات، چرچ راہب خانے (Monastries) اس نظام کے سب سے بڑے ذمے دار اور اس سنگ دل استبدادی نظام کا بڑا حصہ تھے۔ جس طرح علاقائی طاقتیں اپنی طاقت اور بادشاہ کی حمایت کا معاوضہ جاگیرداری اور تعلقہ داری کی شکل میں وصول کرتے، اسی طرح وہ مذہبی طبقات کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جاگیریں دیتا تھا۔ یہ راہب اور بڑے پادری بھی Duke نواب اور امیر Count کہلاتے۔ اس ظلم واستبداد اور بے رحم اقتصادی وسماجی نظام کے خلاف کبھی کوئی آواز اٹھتی یا اصلاح کی کوشش ہوتی تو وہ اس ظالم جاگیرداری کی حمایت میں سب سے آگے ہوتا۔ اور اپنے کلیسائی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اصلاح کا مطالبہ کرنے والوں کو بددین قرار دیتا اور ان کو سزائیں دیتا اور دلواتا۔ سچا دین اگر عدل وانصاف کا پیامبر ہوتا ہے تو چرچ اس بھیانک ظلم کا پشتیبان اور نقیب تھا۔

''مذہب'' کے بارے میں بے اطمینانی:

اس صورت حال سے پورے مغرب میں فطری طور پر بے اطمینانی پیدا ہوتی تھی۔ مگر ظلم وتاریکی کے خلاف کسی تحریک کے لیے جو ذہنی آزادی شرط ہے، چرچ کے مذہب نے اس کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ گیارہویں صدی میں عالم اسلام سے رابطہ بھی ان اسباب میں سے ایک تھا جن کے نتیجے میں یورپ میں بغاوت کی آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے یورپ کے علم حاصل کرنے کے لیے آنے والے لوگوں نے اسلامی اندلس کو دیکھا، پھر صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے بے شمار لوگ مسلم دنیا کو اندر سے دیکھ کر گئے۔ یہاں ان کو ایک دوسری ہی دنیا نظر آئی۔ جہاں انصاف تھا۔ سماجی عدل تھا۔ کسان آزاد اور خوش حال تھے۔ نہ کوئی چرچ تھا نہ مذہبی اجارہ دار طبقہ۔ اور علم کی قندیلیں ہر جگہ روشن تھیں۔ اب مغرب کے بے شمار سمجھ دار لوگوں میں اپنے پورے مذہبی سماجی اور سیاسی نظام سے بغاوت پیدا ہوئی اور اس باغیانہ فکر کا سب سے بڑا سبب مغرب کی سب سے بڑی لعنت یعنی اس کا اہل مذہب طبقہ تھا۔

احتساب کی عدالتیں INQUISITION:

مذکورہ اسباب کی وجہ سے مذہب کے بارے میں شبہات، بے چینی اور چرچ سے ناراضگی کا سلسلہ تو کافی دن سے چلا آرہا تھا، ان لوگوں کی تعداد تعداد لگاتار بڑھتی جارہی تھی جو اس جاہلانہ وظالمانہ نظام کے کلاف اعتراضات کرتے تھے۔ آخر ۱۳ ویں صدی کے شروع میں انوسنٹ چہارم کی قیادت میں چرچ نے باقاعدہ اپنی پوری طاقت کے ذریعے ان کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۲۱۵ء میں لاتیران کونسل نے فیصلہ کیا کہ ملحدین کے استیصال کے لیے احتساب کا شعبہ قائم کیا جائے۔ خاص طور پر اندلس، اٹلی جرمنی اور فرانس میں اس شعبے کے جاسوسوں کے ذریعے مشتبہ لوگوں کو گرفتار کرکے سخت دردناک سزائیں دی جاتیں یہاں تک کہ وہ اپنے جرم یعنی عقائد کا اعتراف کرلیتے، مقدمہ چلتا، جس میں مدعی اور منصف دونوں کا کردار بشپ کا ہی ہوتا، عموماً سزا قتل ہوتی۔

عقل ومذہب کی کشمکش:

اندلس سے یورپ کو سائنسی طرز فکر کی تعلیم ملی۔ کائنات پر غور کرنے کا حوصلہ ملا۔ دوربینیں خلائی سیاروں کا مطالعہ کرنے لگیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ

تحریف کے نتیجے میں مقدس کتابوں میں زمین، سورج اور فلکیات و ہیئت اور تاریخ کے بارے میں ایسے خیالات داخل کر دیے گئے تھے جو اپنے زمانے میں مسلم تھے۔ یہ افکار نئے اندازوں کے خلاف تھے۔ کلیسا کی سادگی تھی کہ اس نے شارحین و مفسرین کے کلام کو بھی الٰہی تقدس کا جامہ پہنا دیا۔ عیسائیت کی مقدس کتابوں ہی کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی، جن میں سے اکثر کو وحی و آسمانی علم سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔ دوسرا چرچ اور مقدس پوپوں کی تفسیرات سب مسیحی علم عقائد کے اعتبار سے غلطی سے مبرّا اور دینی عقیدے کا درجہ رکھتے تھے۔ چرچ کا ردعمل سائنس دانوں اور نئے تحقیق کرنے والوں کے مطالعات پر یہ تھا کہ یہ سب نفاق وضلال ہیں اور ان سے روکنا ضروری ہے۔

دوسری طرف یورپ میں گویا تجدد اور عقلیت پرستی کی آگ لگ رہی تھی۔ محققین نے کلیسا کے بے اصل نظریات کے خلاف اپنی تحقیقات کا جسارت آمیز اظہار شروع کر دیا تھا۔ مذہبی طبقے کی جہالتوں اور اخلاقی پستی نے سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے اعتقاد کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، باقی یہ نئے سائنسی تصورات ختم کیے دے رہے تھے، اور چرچ کو بجا طور پر اپنا وجود خطرے میں نظر آ رہا تھا۔

ادھر لوگوں کے باغیانہ خیالات بڑھتے جا رہے تھے اُدھر چرچ کی خون آشامی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نظام کے شکار ہونے والوں میں وہ سائنٹسٹ بھی تھے جن کی تحقیقات سے کلیسائی عقائد وتصورات کی چولیں ہل رہی تھیں۔ سب سے بڑا مسئلہ اُن تحقیقات نے پیدا کیا جو زمین کے کُرَوی یعنی گیند نما ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ اور کلیسا کی ''کتب مقدسہ'' کا عقیدہ تھا کہ زمین مسطح ہے۔ خاص طور پر زمین کی شکل اور نظام شمسی میں اس کا مقام یہ وہ مسائل تھے جن میں جدید تحقیقات کلیسا کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہوگئی۔ ارباب کلیسا نے ان سائنٹسٹوں کی تکفیر کی اور احتساب کی عدالتوں میں انہیں کھینچا۔

ان سائنٹسٹوں میں سے تین آدمی کلیسا کے ظلم کے سلسلے میں مثالی شہرت رکھتے ہیں۔ کوپرنیکس (Copernicus. 1543) گردانو برونو (Giordano Bruno. 1600) گیلیلیو (Galileo. 1642)۔ سو سال کے عرصے میں ان تین کو کلیسا نے سخت سزائیں دیں۔ کوپرنیکس تو بھاگتا پھرا اور کلیسا کے جاسوس اس کا پیچھا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ ان کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی مر گیا۔ برونو کا احتساب کیا گیا اور الحاد ارتداد کے جرم میں اس کو درندگی کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا۔ گیلیلیو کا انجام شاید سب سے دردناک ہوا۔ اس کو دس سال قید و بند اور سخت تعذیب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بیچ میں اس نے بار بار اپنے رجوع و توبہ کا اعلان کیا اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر معافیاں مانگیں۔ اور جب وہ مرا تو اس کی لاش کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن بھی نہیں ہونے دیا گیا۔

ان عدالتوں کے جاسوس پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ جو لوگوں کو معمولی شبہوں پر پکڑ کر حاضر عدالت احتساب کیا کرتے تھے، جہاں ان کو سخت دردناک سزائیں دی جاتیں یہاں تک کہ وہ اپنے جرم یعنی عقائد کا اعتراف کر لیتے۔ اس دور میں لاکھوں لوگوں پر ایسے مقدمے چلے، جن کو گرفتار کیا جاتا تعذیب کے دردناک آلات سے ٹانگیں توڑی جاتیں، جسم کو داغا جاتا، لوہے کی میخوں پر باندھ کر جسم لہولہان کیا جاتا، مورخین نے ان سزاؤں میں استعمال کیے جانے والے آلات کی جو ہاتھوں کی بنائی گئی تصویریں دی ہیں وہ رونگٹے کھڑی کرنے والی ہیں۔ ہزارہا ہزار بلکہ لاکھوں قتل کیے گئے، تیس ہزار زندہ جلائے گئے۔ کئی صدی تک یہ خونخوار نظام قائم رہا۔ یورپ کے اس درندگی سے بھرپور ''مذہبی'' نظام کی مکمل دستاویزی تاریخ ہنری چارلس نے تین جلدوں میں لکھی ہے، جو خوف ناک اور دردناک تفصیلات پر مشتمل ہے۔

Henry Charles Lea, A History of the Inquisition in the Middle Ages, 3 vol. (1887, reissued 1958)

قرون مظلمہ پر ایک اچٹتی نظر:

مغرب کے اس دور کا اگر آپ خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شدید جہالت اور تاریکیوں کا دور تھا،علم کا کوئی رواج نہیں تھا۔

(۱) مذہب جاہلانہ افکار و خیالات اور ظلم کا مجموعہ بن چکا تھا، مذہبی طبقات جاہل و ظلمت پسند ہونے کے علاوہ نہایت لالچی، مال کے پجاری، آخری درجے پست اخلاق تھے۔ان طبقات کے استحصال کا یہ عالم تھا کہ چرچ یورپ کی ایک تہائی زمین کا مالک بن بیٹھا تھا۔کہیں کہیں ملک کی کل دولت کا نصف یا دو تہائی تک اس کے پاس تھا۔ یہ چرچ قرون مظلمہ کی سب سے بڑی سیاسی اور سماجی طاقت تھا۔ پورے سماج کو یہی چلاتا تھا۔

(۲) اقتصادی نظام یوروپین جاگیرداری پر قائم تھا۔لقمۂ زندگی کے لیے انسانوں کی نہایت بڑی تعداد کا انحصار زمین پر تھا،اور کسان صرف چار فی صد زمین کے مالک تھے۔ باقی پوری زمین تعلقے داروں اور جاگیرداروں کی تھی۔جن میں Serf یعنی زمین کے غلام نہایت کس مپرسی کے حال میں کھیتی کرتے تھے۔ چرچ سب سے بڑا جاگیردار بھی تھا۔ چرچوں اور راہب خانوں کی جاگیریں بادشاہوں کی املاک سے بھی زیادہ تھیں۔

(۳) عوام میں چرچ کی عقیدت اور اثر و رسوخ کی وجہ سے عموماً بادشاہ چرچ کو راضی رکھ کر یا سودے بازی کے ذریعے ان کی حمایت لے کر ہی حکومت کر سکتے تھے۔ بادشاہ، جاگیردار اور چرچ تینوں اس ظلم، تاریکی، اور تسلط کے نظام میں شریک تھے۔مفادات کی تقسیم میں چرچ کا حصہ سب سے بڑا تھا۔ وہ اس لیے بھی سب سے بڑا مجرم تھا کہ وہ روحانیت و اخلاق کا نام لے کر اور ردائے تقدس پہن کر بھی ایسی درندگی سے بھرپور ظالمانہ نظام کا حصہ بلکہ نقیب و قائد بنا ہوا تھا۔

چرچ، بادشاہ، اور جاگیردار مل کر ظلم و استبداد کا ایک مثلّث (Triangle) تھے جس کے نتیجے میں مغربی قومیں ایک مذہبی، اقتصادی اور سیاسی غلامی کے شکنجے میں صدیوں سے جکڑی ہوئی تھیں۔اور اس ظلم میں سب سے بڑا حصہ بلا کسی شبہہ کے چرچ کا تھا۔

جدید مغرب کا آغاز وارتقا:

یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس کے بطن سے جدید مغربی فکر برآمد ہوئی ہے۔خدا و روحانیت کے انکار، دین و مذہب سے بیر، اخلاق و حیا کے تصورات کی مخالفت جیسی چیزیں کسی علمی مطالعے کا نتیجہ نہیں، بلکہ خالص ردعمل کی نفسیات کا اثر ہیں۔مغربی تہذیب دراصل اپنے ماضی کے خلاف بغاوت سے پیدا ہوئی ہے۔ گیارہویں صدی سے مغرب کے اہل دانش و عقل کے دلوں میں ظلم و جہالت کے خلاف جو لاوا پکتا چلا آ رہا تھا، چودھویں پندرھویں صدی میں آ کر وہ بری طرح پھٹ پڑا۔ یہ اس دور کا آغاز ہے جسے مغربی مؤرخین نشأۃ ثانیہ(Renaissance) یا میلاد جدید(Rebirth) کہتے ہیں۔ یہ دراصل مغرب کی اپنے ماضی کے خلاف ذہنی بغاوت کا دور ہے، جس کا ایک علمی اور ذہنی تحریک کے طور پر آغاز اٹلی سے ہوا اور جلد ہی اس نے پورے مغربی و شمالی یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اٹھارہویں صدی کے آتے آتے یہ بغاوت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔اس باغیانہ تحریک کا نشانہ جاگیردارانہ نظام اور چرچ اور مذہب تھے۔خاص طور پر عقل و جذبات اب دونوں مذہب اور اس کے نام لیواؤں اور قائدین کے خلاف زیادہ سخت پوزیشن اختیار کر چکے تھے۔اس دور میں مغرب میں کثرت سے ایسے فلسفی اور ادباء و مؤرخین پیدا ہوئے جنھوں نے مذہبی نظریات کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اب پورے یورپ میں چرچ اور اس کے مذہب کے خلاف بغاوت کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ چہار سو اہل دانش، مفکرین اور فلسفیوں کی طرف سے چرچ اور اس کے مذہبی نظام پر تنقید کی آوازیں بلند تھیں۔ یہ عقلیت پسند و اہل دانش مذہبی طبقوں اور ان کے جمود و جہالت اور جبر تشدد سے ایسے بیزار و مشتعل ہوئے کہ ان کو ایسے تمام مذہبی عقائد و علم اور اخلاق سے نفرت ہوگئی جن کی نسبت مذہب کی طرف ہو۔(اٹھارہویں صدی کے آخر میں) فرانسیسی انقلاب کے ذریعے آخر کار یہ بغاوت ماضی کے تمام نشانات کو ملیامیٹ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔اس تاریخ کے نہایت سرسری مطالعے سے بھی یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جدید مغربی تہذیب و فکر کی مادّیت والحاد اس کے اُس خمیر کا حصہ ہے جس سے اس کا اٹھان ہوا ہے۔

انسانی تاریخ ایک نیا دور اور

اس کی سب سے بڑی گمراہی:

اب یہ تاریخ انسانی کا بالکل نیا اور عجیب دور آیا جس میں مغرب چرچ کی عیسائیت سے منحرف ہوا تو اس نے جلد بازی میں چرچ کے ساتھ ہی تمام مذاہب کے بارے میں یہی گمان کر لیا کہ ہر مذہب جہالت اور ظلم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ تمام مذاہب سے یک لخت بیزار و برگشتہ اور باغی و منحرف ہو گیا۔ یہ انسانی تاریخ کے لیے ایک نئی صورت حال تھی۔ انسانی تاریخ میں آسمانی رہنمائی پر قائم یا اس کی طرف منسوب مذہب ہی ذاتی اور معاشرتی زندگی کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتا تھا۔ مذہب کتنا بھی تحریف اور بگاڑ کا شکار ہو جاتا تھا اس کے پاس انسانی ذہن کے بنیادی سوالوں کے جواب ہوتے تھے۔ وہ بتاتا تھا کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک طاقتور علیم و قدیر رب ہے، انسان ایک اچھی شریف مخلوق ہے۔ جس کو خیر پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے پاس خیر و شر کے مستقل معیار (Values) ہوتے تھے، سماجی زندگی کے ضوابط ہوتے تھے۔ وہ بتاتا تھا کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا؟ اگر کسی مذہبی نظام کی فرسودگی یا بگاڑ اس کو از کار رفتہ بنا دیتا تھا، تو کوئی دوسرا مذہبی نظام جو بہر حال کچھ نہ کچھ بنیادی آسمانی صداقتوں اور اخلاق و روحانیت کے اصول رکھتا ہوتا، سامنے آجاتا تھا۔ سدا سے انسانی معاشرے اسی طرح چلتے آئے تھے۔ مگر مغرب کے دانشوروں نے بڑی انتہا پسندی اور عجلت کے ساتھ یہ رائے قائم کی کہ ہر مذہب جہالت اور اوہام و خرافات کا پلندہ ہے، اس نے جو کچھ بھی بتایا اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب اِس انسان کے سامنے اس کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ انسان کی رہنمائی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی کے انتظام کے لیے اپنے نئے فکر و مزاج کے مطابق نئے اصول و ضوابط کی تشکیل کرے۔ ان میں سے کسی نے سنجیدگی کے ساتھ صداقت کا پتہ لگانے کے لیے اللہ کے آخری اور محفوظ دین اسلام کا مطالعہ تک نہیں کیا۔

مغرب نے چرچ کی غلامی کا جوا اپنے کندھے سے اتار کر علم و فکر کی وادی میں جب از سرِ نو تحقیق و جستجو کا سفر شروع کیا تو وہ کسی معتدل نفسیاتی کیفیت میں نہیں تھا۔ غلط مذہب اور چرچ کے ساتھ اس کا جو طویل و المناک تجربہ ہوا تھا اس کا اس پر شدید اثر اور ردعمل تھا۔ اس ردعمل کی کیفیت کے ساتھ زندگی اور اس کے مسائل پر غور و فکر شروع ہوا۔ نتیجۃً انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے مذہب دشمن بنیادیں تراشی گئیں۔ Anthropology علم الانسان، تاریخ، نفسیات، سماجیات، اخلاق، معاشیات، سیاسیات وغیرہ تمام علوم کی از سرِ نو داغ بیل ڈالی گئی۔ اتفاق کہیے یا انسانیت کی بدقسمتی کہ اس دور میں مغربی معاشرے صلاحیتوں اور ذہانت سے لبریز تھے۔ علمی جستجو، اور تحقیق و تفتیش کا مزاج عام تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی روشن خیالی اور عقلیت پسندی کے نام سے اٹھنے والے رجحان کا نقطۂ عروج تھی۔ فرانسیس بیکن (۱۶۲۶ء) ڈیکارٹ (۱۶۵۰ء)، اسپنوزا (۱۶۷۷ء)، جان لاک (۱۷۰۴ء)، نیوٹن (۱۷۲۷ء)، وولٹائر (۱۷۷۸ء)، مانٹسکیو (۱۷۵۵ء)، ہیوم (۱۷۷۶ء) اور امانویل کانٹ (۱۸۰۴ء) جیسے مفکرین نے فکر و خیال کی دنیا میں انقلاب کی آگ لگا دی۔ ان دانشوروں ایک ایسے معاشرے کو جو مذہب کے خلاف جذبات سے بھر چکا تھا اپنی ذہانت سے نئے فکری و علمی متبادل دینے کا دعویٰ کیا۔ جس کا نہایت جذباتی استقبال کیا گیا۔

دوسری طرف اسی دور میں کئی ایسے واقعات ہوئے جس نے مغربی دانشوروں اور مفکرین کے اس فکر کی نہایت تیز رفتار اشاعت کے اسباب پیدا کر دیے۔ ان میں سے پہلی چیز صنعتی انقلاب ہے۔ جس نے بہت بڑی اور گہری معاشرتی تبدیلیوں کے لیے راہ فراہم کی۔ بڑے کارخانوں کے قیام کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر قائم ہونے لگے، ان شہروں میں نئے طرز کے اسکول قائم ہوئے۔ ان شہروں اور اسکولوں کے ذریعے نئے خیالات کو پھیلنے کا خوب موقع ملا۔ پھر پریس کی ایجاد نے افکار و خیالات کی اشاعت کو برق رفتار بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مغرب نے مشرقی ممالک کو فتح کرنا شروع کیا۔ مشرق میں مغرب صرف تلوار کا فاتح ہی نہیں ثابت ہوا، بلکہ اس کے سر میں ایک نئے قسم کی پیمبری کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک علم و روشنی صرف مغرب کا یہ نیا ذہن ہی دے سکتا تھا۔ لہٰذا استعماری حکومتوں نے مفتوح مشرقی ممالک کے نظام تعلیم کو مغرب کے تابع بنا دیا۔

رہنمائی کے مقام سے مذہب کے زوال کے بعد اب مغرب کو زندگی کی رہنمائی اور معاشرے قیام کے لیے کسی اور بنیاد کی تلاش ہوئی۔ مغرب کے

فلسفیوں اور دانشوروں نے زندگی کے ہر میدان کے لیے نئی بنیادوں کی تلاش کا کام شروع کیا۔ مذہب اگر کہتا تھا کہ دنیا کا خالق و مالک اور اس کو چلانے والا خدا ہے تو نئے دور میں خالقیت اور تدبیر کائنات کا یہ مقام اندھی بہری فطرت (Nature) دیا گیا۔ انسانی نفسیات کیا ہیں؟ اس کے جواب میں مذہب بتاتا تھا کہ انسان کی فطرت میں خیر اور شر کی پہچان اور نیکی کا جذبہ ہے۔ انسان کی سعادت خیر پر عمل میں مضمر ہے۔ مگر اس جواب پر مذہب کا ٹھپّہ دیکھ کر دانشمندان مغرب کے جبینیں نفرت وحقارت کے ساتھ شکن آلود ہوگئیں۔ بس کیا تھا، انسانی فطرت اور نفسیات کی نہ صرف لا دین بلکہ ایسی خبیث و رذیل تشریحیں کی گئیں کہ شرم سے سر جھک جھک جائے۔ مذہب نے بتایا تھا کہ انسان ایک شریف واعلیٰ مخلوق ہے جس کو خداوند قدوس نے ایک علوی عالم میں پیدا کیا تھا۔ جواب ارشاد ہوا نہیں! وہ ذلیل حیوان ہے، کیڑوں مکوڑوں اور بندروں کی نسل سے ہے۔ انسانی تاریخ کا آغاز حیوانیت سے ہی کرنے پر اکتفا نہیں ہوا۔ بلکہ بتایا گیا کہ جنگلوں میں درندوں اور غاروں میں سانپوں اور بچھوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اور عدم تحفظ کے احساس نے اس کو کسی ان دیکھے خدا کا طلب گار اور اس سے اپنی حفاظت کا خواستگار بنا دیا۔ یہاں سے مذہب اور عبادت و دعا کا آغاز ہوا۔ خیر وشر کی تمیز مذہب کی سب سے بڑی رہنمائی تھی۔ انسانی تہذیب وتمدن اسی خیر وشر کے احساس پر قائم ہیں۔ مگر ان دانشوروں اور مفکرین کے لیے اس خیر اور شر جیسے یقینی فطری احساس کا بھی انکار واجب تھا، اس لیے کہ ان میں سے مذہب کی بو آتی ہے۔ اور یہاں مذہب سے مالیخولیا کی حد تک چڑ تھی۔ اس لیے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ سب سماج کے ڈھکوسلے ہیں۔ وہ اپنے مصالح ومفادات کے لیے ہر دور میں خیر وشر کے پیمانے گھڑتا رہتا ہے۔ مذہب کا ایک اہم کارنامہ خاندانی نظام کا استحکام تھا، جو نکاح اور نسب کے تصور پر قائم تھا۔ اس کے بارے میں رائے یہ قائم کی گئی کہ حضرت انسان جب جنگلوں میں ننگے رہتے ہوں گے اور جانوروں کی طرح زندگی گزارتے ہوں گے، اس وقت کی بات ہے کہ مرد نے دیکھا کہ عورت کمزور جسمانی طاقت رکھتی ہے۔ اس لیے ایک ایک آدمی کیوں نہ پکڑ پکڑ کے ایک ایک عورت کو اپنا محکوم وتابع بنا لے۔ اسی محکومیت اور غلامی کے استحکام کے لیے نکاح کا دستور (Institution) ایجاد کیا گیا۔ آغاز انسانیت (Anthropology علم الانسان) کے بارے میں مغرب کے یہ مفکر یہ سب دعوے اس تیقن کے ساتھ کرتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ چشم دید داستان بیان کر رہے ہیں۔

جدید جاہلیت کی اصل بنیاد:

اہل مغرب دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف سائنسی طرز تحقیق جس کی بنیاد مشاہدہ وتجربے پر رکھی گئی تھی، حقائق اشیاء اور کائنات کے بارے میں پے بہ پے صحیح دریافتیں کر رہے ہیں، اور دوسری طرف اس طرز تحقیق کے مقابلے میں عیسائی کتب مقدسہ اور آسمانی علم کے دعوے داران کے نام لیواؤں کے دعوے روز غلط ثابت ہوتے جا رہے تھے۔ اس چیز نے ان سے ایک نہایت گہری اور تباہ کن تاریخی غلطی کروادی۔

ردعمل کے اس دور کی یہ تاریخی غلطی تھی کہ یہ اصول طے پایا کہ علم ودریافت کا واحد صحیح طریقہ حسّی مشاہدہ وتجربہ ہے جو مادی سطح پر کیا جائے۔ اور جو چیز حسی مشاہدے سے ثابت نہ ہو سکے وہ حقیقت اور سچائی نہیں ہے۔ یہی چیز مغربی فکر وتہذیب کا مزاج اور سرشت بن گئی۔ حواس کے ذریعے جو علم حاصل نہ ہو، چاہے اس کے حق میں وحی کی یقینی شہادت ہو چاہے فطرت وضمیر کی واضح رہنمائی، مغرب اس کا انکاری ہی ہوگا۔

روحانیت، خدا پرستی، خالق کائنات کے حضور نیازمندی وسرافگندگی، نیز دنیا کے بعد آخرت کی زندگی جیسے معاملات اور اخلاق اور خیر وشر کا مسئلہ باطنی احساس اور فطرت وضمیر میں پوشیدہ ہے۔ ہر سادہ انسانی دل اپنے اندر خدا پرستی اور سچی روحانیت کی جانب میلان رکھتا ہے۔ ہر ایک کو ایک بڑی حد تک خیر وشر کا امتیاز اور اچھے برے کا احساس ہے، یہی خیر اور کمال حاصل کرنے کا مزاج واحساس اور اچھے برے کی تمیز انسان اور حیوان کا فرق ہے۔ فطرت انسانی ان کو تسلیم کرتی ہے۔ مگر چونکہ ان حقائق کا ادراک مادی تجربے اور حسی مشاہدے سے نہیں کیا جا سکتا اس لیے مغرب ان کو حقیقت اور واقعہ ماننے سے صاف انکار کرتا ہے، اس کی منطق میں اخلاق وضمیر، اور آسمانی علم وروحانیت کی حیثیت اوہام وخرافات اور سماج کے ان ڈھکوسلوں کی ہے جن کو مختلف طبقات نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے گھڑ لیا تھا۔

مغربی فکر وتہذیب کی یہی وہ تاریخی غلطی تھی جس کے بیج سے یہ فاسد فکر وتہذیب کا درخت پیدا ہوا ہے اور اب پوری دنیا میں اس کے پھلوں کی فصل پائی جاتی ہے۔

اس تہذیب میں انسان وانسانیت کو کس نظر سے دیکھا گیا ہے؟ انسان کا کائنات میں کیا مقام تجویز کیا گیا ہے؟ اور انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے کیا تصور دیا گیا ہے اس کا کچھ تفصیلی اندازہ کرنے کے لیے ہم ائندہ باب میں اس کے کچھ تاریخ ساز قسم کے مفکرین اور اہم نمائندوں کے افکار کا خلاصہ وتعارف پیش کرتے ہیں۔